Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
(Bi-Annual) Trilingual: Urdu, Arabic and English
ISSN: 2707-1200 (Print) 2707-1219 (Electronic)
Home Page: http://www.arjish.com
Approved by HEC in "Y" Category
Indexed with: IRI (AIOU), Australian Islamic Library, ARI, ISI, SIS, Euro pub.
Published by the Al-Khadim Foundation which is a registered organization under the Societies Registration ACT.XXI of 1860 of Pakistan
Website: www.arjish.com
Copyright Al Khadim Foundation All Rights Reserved © 2020
This work is licensed under a
Creative Commons Attribution 4.0 International License

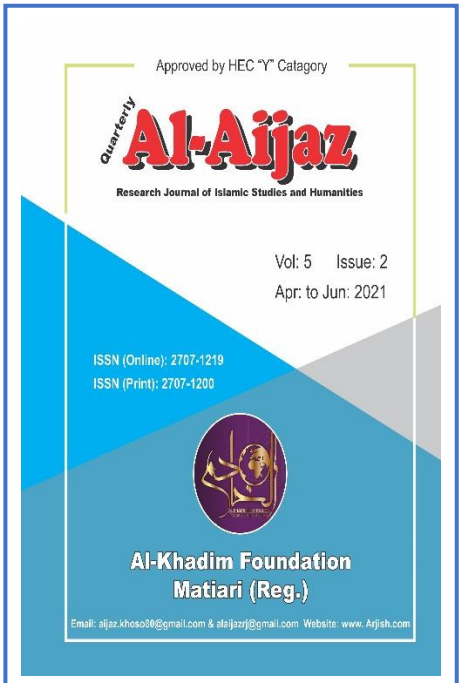

TOPIC:

Inorate, literary style, manner and procedure of the commentary of "Lame-ud-durari" (Sharh-e-Sahih Bukhari)

AUTHORS:

1. Muhammad Usman Shah, Ph.D scholar, Department of Islamic Studies & Arabic GUMAL University DI Khan.
Email: masoodahmad08@gmail.com
2. Dr. Manzoor Ahmed, Ph.D scholar, Department of Islamic Studies & Arabic GUMAL University DI Khan.
Email: drmanzor67@yahoo.com

How to cite:
Shah, M. U., & Ahmed, M. (2021). Urdu-19 Inorate, literary style, manner and procedure of the commentary of "Lame-ud-durari" (Sharh-e-Sahih Bukhari). *Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities*, *5*(2), 244-258.
https://doi.org/10.53575/Urdu19.v5.02(21).244-258

URL: http://www.arjish.com/index.php/arjish/article/view/329

Vol: 5, No. 2 | April to June 2021 | Page: 244-258

Published online: 2021-06-20

QR Code

لامع الدراری (شرح صحیح بخاری) کا ادبی آہنگ و منہج واسلوب

Inorate,literary style, manner and procedure of the commentary of "Lame-ud-durari" (Sharh-e-Sahih Bukhari)

Muhammad Usman Shah*
Dr. Manzoor Ahmed**

Abstract
The reseach article contains discussion about the literary style, manner and procedure of the commentary Lame-ud-durari Sharh e Saheeh Bukhari.Each and every commentator has his own style in determining and elaborating a book.Mawlana Rashid Ahmad Gangoohi has his own way of explaining.He has speciality in brief summary of a special context.This article deals with the charachteristic qualities of Mawlana Rashid Ahmad Gangoohis commentary.His commentary is remarcably comprehanssive.He has the falicity to discusss pecific details briefly.He has given relationship to the previous hadith.hehas done remarkable research of the Abu Hanifa sect as well as other sects and has presented specific example in this regard in his commentary.Thus he has made the literary style and manner of Lame-ud-durari very clear and lucid.
Keywords: Hadith, Muhadeseen, Sehah-e-sitta, Literary, Inorate, procedure of commentary.

تعارف:

"كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر"۔[1]

ترجمہ: "اے مسلمانو! تم بہترین امت ہو جو لوگوں کیلئے ظاہر کی گئی ہے۔ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو"۔

امت مسلمہ فرائض نبوت میں سے دعوت خیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نبی ﷺ کی جانشین ہے۔ اسلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کار نبوت کے جو فرائض عطا ہوئے وہ درجہ بدرجہ امت میں اور خلفائے راشدین کی عملی زندگی کا نقشہ محدثین نے ہو بہو نقل کیا۔ اس پر ہر دور میں اس دور کے مسائل کے حل کیلئے ماہرین حدیث نے کام کیا۔ برصغیر پاک وہند بھی ان خطوں میں سے ایک ہے جہاں حدیث پر کافی و شافی کام ہوا ہے۔ اس خطہ میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی حدیثی خدمات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ آپؒ نے علم حدیث میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے طریقہ تفہیم حدیث کو آگے بڑھایا۔ علم حدیث میں آپؒ کا ایک معرکۃ الآرا کام صحیح بخاری کی شرح "لامع الدراری" ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اس شرح کے ادبی آہنگ و منہج واسلوب پر کام کیا گیا ہے۔

مقاصد تحقیق:

ہر تحقیق اپنے اندر ایک خاص مقصدیت رکھتی ہے۔ زیر نظر تحقیق کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے اس معرکۃ الآراء تحقیقی کام کے ادبی آہنگ و منہج واسلوب بیان کئے جائیں تاکہ واضح ہو کہ آپؒ نے کس اسلوب کو اپنایا ہے، حدیث کے متعلقات کو کس انداز میں پیش

* Ph.D scholar, Department of Islamic Studies & Arabic GUMAL University DI Khan.
Email: masoodahmad08@gmail.com
** Ph.D scholar, Department of Islamic Studies & Arabic GUMAL University DI Khan.
Email: drmanzor67@yahoo.com

کیا ہے، حدیث کے اندر اختلافی مسائل میں ترجیحی اصول اپنائے ہیں یا تطبیقی، اختلافی مسائل کے حل میں کس امام کے مذہب کو ترجیح دی ہے اور کیوں؟ یہ سارے وہ بنیادی سوالات ہیں جن کو مقصد بنا کر اس مقالے میں ان کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ترجمۃ الباب کے مقصد کی وضاحت:

اس شرح کی سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ بخاری شریف کے پیچیدہ ترجمۃ الباب اور پھر حدیث باب کے ساتھ ان کی مطابقت اور ربط۔ تو دیگر شارحین اپنی شروحات میں اس پر لمبی چوڑی بحثیں اور تقریریں کر لیتے ہیں لیکن اسکو اس طرح کھول کر حل نہیں کر پاتے جس سے عام طالبعلم کا دل مطمئن ہو اور وہ پوری طرح سمجھ جائے۔ دل میں کچھ نہ کچھ خلجان باقی رہتا ہے۔ جبکہ اس شرح کییہ خاصیت ہے کہ اس میں حضرت گنگوہیؒ ترجمۃ الباب اور حدیث باب کے بارے میں انتہائی مختصر لیکن جامع مانع انداز میں ایسی بحث کر لیتے ہیں کہ سارا مسئلہ بے غبار ہو جاتا ہے اور اس پر طالبعلم کا دل ایسا مطمئن ہو جاتا ہے کہ کسی قسم کا خلجان باقی نہیں رہتا۔[2]

جامعیت:

اس شرح کی سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ یہ انتہائی مختصر لیکن جامع مانع ہے۔ اور جوامع الکلم والی بات کا مصداق بن جاتی ہے۔ کوئی لمبی چوڑی بحث اور ضرورت سے زائد باتیں اس میں نہیں ہوتیں۔ لیکن پھر بھی عوام الناس جو لمبی چوڑی تقریروں سے سمجھنے کے عادی ہوتے ہیں تو اس کمی کو تعلیقات کے ضمن میں کماحقہ' پورا کیا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت گنگوہیؒ کی اس شرح میں یہ عادت رہی ہے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ جن مسائل کو دیگر شارحین نے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس کو انہوں نے چھوڑا نہیں تو حضرت گنگوہیؒ نے زیادہ اس کو چھیڑا نہیں۔ اور جن مسائل کو دوسرے علماء نے چھیڑا نہیں تو حضرت گنگوہیؒ نے اسکو چھوڑا نہیں بلکہ کھل کر اس پر بحث کی ہے۔ اور اس خاصیت مذکورہ کو مقدمہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

"ومن الملائم ان اقدم امثلة من البحاث "اللامع" دررا عن ذٰلک البحر العذب الفرات - لکن تبخلی امام الباحث ان ھذہ الشروح الفیاضة البدیة مع الساعھا و کثرۃ فوائدھالا تستغنی عن امثالھا ---الخ"۔[3]

ترجمہ: "فرماتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ میں لامع الدراری کے ابحاث میں سے چند مثالیں پہلے پیش کروں۔ گو یا وہ میٹھے سمندر کے موتی ہیں۔ تاکہ امام یہ واضح کرے کہ یہ دیگر شروحات اپنی عمدگی، وسعت اور کثرت فوائد کے باوجود ان مثالوں سے مستغنی نہیں۔ یہ مختصر عمدہ شرح (یعنی لامع الدراری) اپنی قصر، اپنے کلمات کے اختصار اور اپنے ابحاث کے ایجاز کے باوجود سارے کا سارا صاف شفاف اور مغز ہے جس سے دوسرے عقلمند بحث کرنے والے مستغنی نہیں ہو سکتے"۔

باب کا ما قبل سے ربط و تعلق:

1- باب: الفتیا وھو واقف علی ظھر الدابۃ او غیرھا:

"عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ان رسول ا اللہ صلی اللہعلیہ وسلم وقف فی حجۃ الوداع بمنی للناس یسألونہ فجائ رجل"۔[4]

"عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے مسائل دریافت کرنے کی وجہ سے منیٰ میں ٹھہر گئے تو ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے نادانستگی میں ذبح کرنے سے پہلے سر منڈا لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب ذبح کر لے اور کچھ حرج نہیں ہوا۔ پھر دوسرا آدمی آیا اس نے کہا کہ میں نے نادانستگی میں رمی کرنے سے پہلے قربانی کر لی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اب رمی کر لے (اور پہلے کر دینے سے) کچھ حرج نہیں ہوا"۔

ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں (اس دن) آپ ﷺ سے جس چیز کا بھی سوال ہو جو کسی نے مقدم و مؤخر کر لی تھی تو آپ ﷺ نے یہی فرمایا کہ (اب) کر لے اور کچھ حرج نہیں۔

اب ذرا ہم شرح لامع الدراری پر نظر ڈالتے ہیں کہ اس نے اس ترجمۃ الباب کو کس طرح جامع و مانع انداز میں اختصار سے بیان کیا ہے۔ کہ مسئلہ بالکل صاف اور بے غبار ہو کے رہ جاتا ہے۔

"باب الفتیاوھو واقف علی ظھر الدابة - قوله - وقف فی حجة الوداع وکان وقوفه اذ ذاک علی ناقته کما ھو معلوم فصحت المطابقة وانما افتقر الی وضع باب لھذا"۔[5]

یہ باب اس بارے میں کہ جانور کی پشت پر کھڑے ہو کر فتویٰ دینا اور پیغمبر ﷺ کا وقوف دابۃ (جانور) کی پشت پر حجۃ الوداع کے موقعہ پر معلوم ہے (ایک اور حدیث سے) اگرچہ حدیث باب میں صراحۃ ذکر نہیں پس باب اور حدیث میں مطابقت ہو گئی۔ (اب ذرا ملاحظہ کریں کہ شیخ گنگوہیؒ ترجمۃ الباب کو کتنے جامع و مانع انداز میں حل کر رہے ہیں اور اس ترجمۃ الباب کی وجہ نقل کر رہے ہیں)۔ فرماتے ہیں کہ مؤلف بخاریؒ اس مقصد کے لئے اس باب کو وضع کرنے کے اس لئے محتاج ہوئے کیونکہ یہ بات پہلے سے معلوم ہے کہ اپنی ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلے میں جانور پر وقوف متروک ہے، ممنوع ہے جیسے کہ روایات میں آیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم اپنے جانوروں کی پشت کو منبر بنانے سے بچو اور دوسری وجہ یہ کہ ایسا کرنے میں جانور کو ایک قسم کی تکلیف بھی دینا ہے۔ پس اس (احتمال ممانعت کو) دور کیا کہ یہ وقوف جائز ہے اشاعت علم کی ضرورت کی وجہ سے۔ کیونکہ اگر دابہ (جانور) پر وقوف نہیں کریں گے تو قریب والوں کے علاوہ (دور والے) پھر خطبہ نہیں سن سکیں گے۔

اب اس مذکورہ ترجمۃ الباب کو ہم دوسری شرح "فتح الباری" میں دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے اس کو حل کرتے ہیں۔

"(قوله باب الفتیا) ھو بضم الفاء وان قلت الفتویٰ فتحتھا والمصادر التیته بوزن فتیا قلیلة' مثل تقیا رجعیٰ قوله وھو ای المفتی "۔[6]

تو اس عبارت میں علامہ ابن حجرؒ پہلے لفظ فتیا کی لفظی تحقیق کر رہے ہیں کہ یہ فتیا ہے فاء کے ضمہ کے ساتھ یا فتویٰ ہے فاء کے فتحہ کے ساتھ ۔ پھر کہتے ہیں کہ باب کی مراد یہ ہے کہ عالم جواب دے سکتا ہے۔ طالب کے سوال کا اگرچہ سوار ہو۔

قولہ' علی الدابہ:

تو اس سے مراد لغت میں ہر وہ شئ ہے جو زمین پر چلے اور ترجمۃ الباب میں بھییہی مراد ہے۔ جبکہ بعض اہل عرف نے اسکو گدھے کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اگر کوئی اعتراض کرے کہ حدیث باب میں تو رکوب کا ذکر نہیں تو جواب یہ ہے کہ اس نے یہ حوالہ کیا ایک اور طرق پر باب الحج میں لائے ہیں۔ اور فرمایا (ناقتہ) اسکے لئے ترجمۃ الباب قائم کیا۔ باب الفتیا علی الدابۃ عندہ الجمرۃ ۔ تو اس میں مختلف طرق سے حدیث لائے۔ جس میں ہے (وقف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ناقتہ) اس طرح مسلم و نسائی میں بھی روایت ہے کہ جس میں ہے (و فیھا رأیت رسول اللہ صلی اللہعلیہ وسلم بمنی علی ناقتہ) یعنی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منیٰ میں دیکھا کہ وہ اپنی اونٹنی پر تھے۔

تبصرہ:

اب دونوں شروحات کی عبارت پر نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آئی کہ فتح الباری کے مصنف نے اپنی عبارت میں ترجمۃ الباب میں مذکورہ الفاظ کی لغوی اور صرفی تحقیق بھی کر لی لیکن بخاری شریف کے باب میں دو چیزیں مطلوب ہیں۔

1- ترجمۃ الباب لانے کا مقصد اور وجہ۔

2- ترجمۃ الباب اور حدیث باب کے درمیان مطابقت۔

اب ذرا دیکھیں آگے علامہ ابن حجرؒ نے شرح فتح الباری میں دوسری بات کو تو بیان کیا ہے اور حدیث کے دوسرے طرق لا کر یہ ثابت کیا کہ ترجمۃ الباب میں دابۃ کا ذکر ہے جبکہ حدیث باب میں دابہ کا ذکر نہیں۔ تو کوئی بات نہیں کیونکہ یہ دوسرے طرق دیکھو۔ اس میں صراحۃ ہے کہ پیغمبر ﷺ دابہ (اونٹنی) پر سوار تھے۔ تو حدیث باب میں بھی یہی مراد ہے کہ پیغمبر ﷺ سوار تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ مذکورہ سوال و جواب کرتے رہے۔ تو گویا ایک قسم کی تطبیق ہو گئی۔ لیکن جو پہلی بات تھییعنی امام بخاریؒ اس باب کو کیوں لائے، کس مقصد کے لئے لائے، تو اس کو فتح الباری میں بالکل چھوڑا گیا ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں ذرا لامع الدراری کی عبارت کو دیکھو کہ انہوں نے کتنے جامع ومانع اور مختصر انداز میں ان دونوں باتوں کو حل کیا گیا ہے۔ پہلے باب اور حدیث باب میں تطبیق بیان کر دی۔ پھر اس ترجمۃ الباب کو لانے کا مقصد بیان کیا کہ امام بخاریؒ کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اپنی ذاتی ضرورت کے لئے سواری کو روک کر اس پر سوار رہنا اور باتیں کرنا وغیرہ۔ تو حدیث کی رو سے اس کی ممانعت ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس سے جانور کو تکلیف اور تھکاوٹ ہوتی ہے تو اس سے یہ شبہ ہوا کہ شاید علم کی اشاعت یا مسئلہ بتانے کے لئے بھی اس پر سوار ہونے کی ممانعت ہو۔ تو یہ باب لا کر اس شبہ کو دور کیا۔ کہ نہیں مسئلہ اور فتویٰ کے لئے اگر سوار ہونے کی ضرورت ہو تو اس کی اجازت ہے۔ کیونکہ اگر نیچے کھڑ ہو کر کوئی مسئلہ بتاتا ہے تو صرف قریب والے ہی سن پائیں گے دور والے نہیں سن سکیں گے۔ اور اگر سواری پر سوار ہو کر مسئلہ بتائے تو دور والے بھی سن پائیں گے جیسے پیغمبر ﷺ نے حج کے موقع پر کیا تھا۔ اونٹنی پر سوار ہو کر وعظ و نصیحت کی اور صحابہ رضی اللہ عنہ کے سوالات کے جواب دیئے۔

تواب دیکھیں اس شرح لامع الدراری کی خصوصیت، کہ کتنے جامع مانع اور مختصر انداز میں ان مذکورہ دونوں باتوں کو ایسا حل کیا کہ کوئی خلجان باقی نہ رہا۔

مختلف فیہ مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کے مسلک اور دوسرے مسالک کی تنقیح و تحقیق:

2- "باب : وضوء الرجل مع امرأته و فضۃ وضوء المرأة و توضا عمربالحميم من بيت نصرانية"۔[7]

امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب قائم کیا اور عنوان یہ دیا کہ آدمی اپنی بیوی کے ساتھ (اکٹھے ایک برتن سے) وضوء کرے اور دلیل کے طور پر دو اثر پیش کئے:

1- جس میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گرم پانی سے وضوء کیا۔

2- جس میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصرانیہ کے گھر میں وضوء کیا۔

اب بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے جو یہ باب قائم کیا کہ آدمی اپنی بیوی کے بچے ہوئے پانی سے وضوء کر سکتا ہے اور دلیل کے طور پر یہ دو اثر پیش کئے، آیا ان کا یہ استدلال صحیح ہے کہ نہیں۔ اور ان آثار اور باب کے درمیان کوئی مناسبت بھی ہے کہ نہیں۔

اب ذرا دیکھتے ہیں کہ لامع الدراری میں شیخ گنگوہیؒ اس کو کس طرح حل کرتے ہیں:

"قوله و توضأ عمر رضی الله عنه ----الخ" ودلالة على الترجمة - لان عمر رضی الله عنه لما يسئل انها هل مسته بالقائ اليد فيه كما هو الحار رضی الله عنه ----الخ"۔[8]

اس میں حضرت شیخؒ فرمارہے ہیں کہ یہ جو اثر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وضوء کیا تو اس کی دلالت ہے ترجمۃ الباب پر۔ وہ اس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس گرم پانی کے بارے میں یہ نہیں پوچھا کہ اس میں ہاتھ ڈال کر کسی نے اس کو مس تو نہیں کیا جیسے لوگوں میں یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ آگ پر رکھے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں تاکہ اس کی حرارت و گرمی کی مقدار دیکھ لیں آیا زیادہ گرم ہے یا کم پس جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں نہیں پوچھا بلکہ خاموشی سے وضوء کر لیا اس سے تو معلوم ہوا کہ اس سے حکم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اس کے ہاں کوئی فرق نہیں اس میں کہ کوئی قربت و عبادت کے طور پر اس میں ہاتھ ڈال دے جیسے وضوء اور غسل کے وقت یا کسی اور حاجت اور ضرورت کی وجہ سے پانی میں ہاتھ ڈال دے (جیسے گرمی اور حرارت معلوم کرنے کے لئے) جیسے گزر گیا۔

اب اسی باب اور مسئلہ کو علامہ قسطلانیؒ اپنی شرح ارشاد الساری میں کس طرح حل کرتے ہیں، اب ذرا اس شرح پر نظر ڈالتے ہیں:

"باب: وضوء الرجل مع امرأته وفضل وضوء المرأة ---الخ"

"هذا (باب) حكم (وضوء الرجل مع امرأته) فى اناء واحد وواو وضوء مضمومة على المشهور- لان المراد منه الفعل - "۔[9]

یہ باب اس بارے میں ہے کہ ایک آدمی اپنی عورت کے ساتھ ایک برتن میں وضوء کرے تو اس کا حکم کیا ہے؟ آگے عبارت میں الفاظ کی لغوی و صرفی تحقیق کر رہے ہیں اور فرماتے ہیں کہ عبارت (باب وضوء الرجل ----الخ) میں وضوء کا واؤ مضموم ہے۔ مشہور قول پر۔ اس لئے کہ

اس سے مراد فعل یعنی وضوء کرنا ہے اور بعض نسخوں میں (مع المرأة) ہے تو یہ امرأة سے عام کیوں کہ یہ بیوی اور غیر دونوں کو شامل ہے۔اسی طرح اگلی عبارت (و فضل وضوء المرأة) میں لفظ وضوء واؤ کے فتح کے ساتھ ہے جس کا معنی ہے کہ وہ پانی جو وضوء سے فارغ ہونے کے بعد برتن میں بچ جائے۔

(وتوضأ عمر بالحميم)حميم حاء کے فتح کے ساتھ ہے۔بمعنی گرم پانی اور یہ "حميم" بروزن "فعيل" کے ہے۔

(و توضأ عمر بالحميم)اب اس اثر کے اسناد کے بارے میں کلام کر رہے ہیں کہ سعید ابن منصور نے اس کو موصول بیان کیا ہے اسناد صحیح کے ساتھ۔ان الفاظ کے ساتھ "ان عمر رضى الله عنه كان توضأ بالحميم و يغتسل منه" تو گرم پانی کے استعمال کے جواز پر اتفاق ہے کہ اس سے وضوء وغیرہ کرے۔ہاں بہت زیادہ گرم مکروہ ہے تاکہ آدمی جل نہ جائے۔

دوسرا اثر (و توضأ عمر رضى الله عنه من بيت نصرانيه)۔اسکو بھی امام شافعیؒ وغیرہ نے موصولا بیان کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "ان عمر رضى الله عنه توضأ من ماء فى جرة نصرانية" کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصرانیہ کے گھڑے میں جو پانی تھا اس سے وضو کیا۔علامہ قسطلانیؒ نے جب لغوی اور صرفیتحقیق بیان کر دی پھر اس کے بعد دونوں کے اثر کے اسناد کے بارے میں کلام کیا اب آخر میں کہتے ہیں کہ ان دونوں اثروں کا ترجمۃ الباب کے ساتھ مناسبت بالکل ظاہر نہیں ہو رہی۔وہ اس طرح کہ جو پہلا اثر ہے یعنی "توضأ عمر بالحميم" تو اس کی عدم مناسبت کو بالکل ظاہر ہے۔رہا دوسرا اثر یعنی "توضأ عمر من بيت نصرانيه" تو یہ اثر اس بات پر تو دلالت نہیں کر رہا کہ وہ پانی نصرانیہ کے استعمال سے بچا ہوا تھا جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وضو کیا بلکہ یہ اثر تو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اہل کتاب کا پانی استعمال کرنا جائز ہے اور نصرانیہ کے جھوٹے پانی کے استعمال کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔کیونکہ وہ پاک ہے۔صرف احمدؒ، اسحاقؒ اور اہل ظواہر کا اختلاف ہے۔اور مدونہ کتاب میں امام مالکؒ کا اختلافی قول ہے کہ نہ نصرانی کے جھوٹے سے وضوء کیا جائے اور نہ اس پانی سے جس میں اس نے ہاتھ داخل کیا ہے۔آخر میں کہتے ہیں کہ ابن عساکر کی روایت میں یہ دونوں اثر حذف ہیں۔اور یہ اولی اور بہتر ہے کیونکہ ان اثروں اور ترجمۃ الباب میں مطابقت اور مناسبت ہے ہی نہیں۔

تبصرہ:

اب ہم نے دونوں شروحات کی عبارتوں پر نظر ڈالی، غور سے پڑھا کہ آیا امام بخاریؒ کا جو غرض ہے اس عبارت سے، ان شروحات میں ان کو کماحقہ بیان اور حل کیا گیا ہے کہ نہیں۔اب سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس باب میں دو مسئلے بیان کئے:

1-آدمی اپنی بیوی کے ساتھ ایک برتن سے وضوء کر سکتا ہے۔

2-بیوی کے وضوء سے بچے ہوئے پانی سے بھی آدمی وضوء کر سکتا ہے۔

اور دلیل کے طور پر دو اثر پیش کئے:

1-حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گرم پانی سے وضوء کیا۔

2-حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصرانیہ کے گھر اس مٹکے کے پانی سے وضوء کیا۔

اب رہی یہ بات جو یہاں حل طلب ہے کہ آیا ان اثروں کی ترجمۃ الباب میں مذکورہ مسئلہ سے کوئی مناسبت ہے کہ ان سے استدلال کیا جائے یا کوئی مناسبت نہیں تو پھر امام بخاریؒ جیسی شخصیت نے ان کو استدلال میں کیسے پیش کیا۔

تو اب ہم نے شرح ارشاد الساری کی عبارت کو بھی دیکھا جس میں علامہ قسطلانیؒ نے باب میں موجودہ الفاظ کی صرفی و لغوی تحقیق بھی کی۔ اور جو دو اثر تھے ان کی اسناد میں اتصال کو بھی ثابت کیا۔ لیکن جو اہم اور حل طلب بات تھی کہ آیا ترجمۃ الباب اور ان دو اثروں میں کوئی مناسبت ہے کہ امام بخاریؒ نے جو ان کو استدلال میں پیش کیا ہے یا مناسبت نہیں تو پھر استدلال کیسے۔ تو علامہ قسطلانیؒ کے درمیان میں مناسبت کو ثابت نہیں کر سکے اور صاف کہہ دیا کہ باب اور ان کے درمیان مناسبت ظاہر نہیں اور آگے کہا کہ ابن عساکر کی روایت ہیں یہ دونوں اثر خلاف ہیں، تو کہہ دیا کہ یہ اولیٰ اور بہتر ہے کیونکہ جب مناسبت نہیں تو پھر لانے کا کیا فائدہ۔ حذف ہی بہتر ہے۔

اب ذرا لامع الدراری کی عبارت پر نظر ڈالتے ہیں کہ اس نے اس بات کو کیسے حل کیا ہے۔ تو دیکھا کہ اس نے اس بات کو حل کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور وہ بھی اتنی مختصر عبارت میں اور باب اور اثروں کے درمیان مناسبت کو ثابت کیا ہے کہ استدلال صحیح ہے۔

حضرت گنگوہیؒ اپنی شرح لامع الدراری میں فرماتے ہیں کہ پہلے اثر میں جو ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گرم پانی سے وضو کیا تو دیکھیں، اس موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاموشی سے اس پانی سے وضوء کیا اور اس پانی کے بارے میں زیادہ تحقیق اور قیل و قال نہیں کیا کہ آیا اس گرم پانی میں تو کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا کیونکہ پانی میں ہاتھ ڈالنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا چاہے وہ ہاتھ ڈالنا وضوء (قربت) کی خاطر ہو یا ویسے۔ بشرطیکہ ہاتھ پر کوئی نجاست وغیرہ نہ لگی ہو اور پرانے زمانے میں غربت کی وجہ سے زیادہ برتن نہ ہونے کی وجہ سے اور زیادہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے عموماً لوگ ٹب جیسے بڑے برتن میں پانی ڈال کر وضوء کرتے۔ اب اس میں ہاتھ ڈال کر پانی نکالتے اور وضوء کرتے۔ جبکہ وضوء والا پانی جو ماء مستعمل ہوتا ہے وہ تو نیچے گرتا۔ اب اس ٹب میں مرد ہاتھ ڈالے یا عورت اس سے کیا فرق پڑتا ہے جب ہاتھ پر کوئی نجاست نہ ہو۔ اور لوگوں کی یہ بھی عادت ہے کہ جب آگ پر پانی کو گرم کرنے کیلئے رکھتے ہیں تو وقفہ وقفہ سے اس میں ہاتھ ڈال کر چیک کرتے ہیں کہ کتنا گرم ہوا ہے۔ تو اب حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گرم پانی سے وضوء کیا خاموشی سے اور اس بارے میں کوئی بازپرس نہیں کی کہ کسی نے ہاتھ تو نہیں ڈالا اس کی گرمائش چیک کرنے۔ کیونکہ اگر ہاتھ کے پانی میں ڈالنے سے پانی کو کچھ ہوتا، ناپاکی وغیرہ آتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضرور اس کے بارے میں پوچھتے اور ویسے وضوء نہ کرتے۔ تو معلوم ہوا کہ پانی میں ہاتھ ڈالنے سے کچھ نہیں ہوتا چاہے مرد ہاتھ ڈالے یا عورت۔ اپنی عورت ڈالے یا غیر۔ وضوء کے لئے ڈلائے یا ویسے چیک کرنے کے لئے، بشرطیکہ ہاتھ پر کوئی نجاست نہ ہو۔ یہی تفصیل دوسرے اثر میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصرانیہ کے گھر پانی سے وضو کیا تو اس میں بھی یہ تحقیق نہ کی کہ اس نصرانیہ نے اس میں ہاتھ ڈالا ہے کہ نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ ہاتھ ڈالنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو اب ذرا دیکھیں کہ حضرت نے کتنی مختصر عبارت ہیں یہ ثابت کیا کہ ان اثروں کا ترجمۃ الباب سے مناسبت بھی ہے اور امام بخاریؒ کا ان سے استدلال بھی صحیح ہے۔ جبکہ ارشاد

الساری کے مصنف نے تو صاف کہہ دیا کہ ان اثروں اور باب میں کوئی مناسبت ظاہر نہیں۔ تو یہ فرق ہے اس شرح کا اور دوسری شروحات کا۔

3- باب الاذان یوم الجمعۃ (جمعہ کے دن اذان)

"حدثنا اٰدم قال حدثنا ابن ابی ذئب عن الزهری عن السائب ابن یزید قال کان النداء یوم الجمعة اولا اذا جلس الامام علی المنبر علی عهدالنبی ﷺ "۔[10]

حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمعہ کی پہلی اذان اس وقت دی جاتی تھی جب امام منبر پر فروکش ہوتے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب جب مسلمانوں کی کثرت ہو گئی تو وہ مقام زوراء سے ایک اور اذان دلوانے لگے۔ ابو عبداللہ (امام بخاریؒ) کہتے ہیں کہ زوراء مدینہ کے بازار میں ایک جگہ ہے۔

اس باب میں اور حدیث باب کو لانے سے امام بخاریؒ کا مقصد کیا ہے وہ کس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، آیا یہ بتلانے کے لئے کہ پیغمبر ﷺ، ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دو اذان کیوں ہو گئیں۔ جس پر آج تک لوگوں کا تعامل چلا آرہا ہے، یا کوئی اور مقصد ہے۔

نوٹ: حدیث باب میں تیسری اذان سے دوسری اذان مراد ہے کیونکہ جمعہ میں دو ہی اذانیں ہیں لیکن راوی نے اقامت کو بھی شمار کر کے اس کو تیسری کہہ دیا کیونکہ اقامت کے ساتھ تین بن جاتی ہیں۔

اب پہلے لامع الدراری کی عبارت کو لاتے ہیں کہ وہ کس طرح اس مسئلہ مذکورہ کو حل کرتے ہیں:

"قوله فلما کان عثمان و کثر الناس---الخ- والناس وان کانوا کثیرین فی زمن الشیخین ایضا "۔[11]

حدیث باب میں جو جملہ ہے (کہ جب عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت آئی اور لوگوں کی تعداد بڑھ گئی) آگے فرماتے ہیں لوگ تو حضرت شیخین (ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ) زمانہ میں زیادہ تھے مگر یہ کہ پیغمبر ﷺ کی قربت صحبت کی برکت سے لوگوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں (جمعہ میں جلدی آنے کو) نہ چھوڑا اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سطوت کی وجہ سے اس زمانہ خلافت میں جمعہ میں حاضر ہونے سے پیچھے رہتے (بلکہ ان دونوں زمانوں میں لوگ جمعہ پڑھنے جلدی اور ٹائم پر حاضر ہوتے) تو اس لئے تیسری (یعنی دوسری) اذن کی ضرورت نہیں پڑی۔ جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے شرمیلے اور حیادار آدمی تھے۔ پس ان کے زمانہ میں خلافت میں لوگ ان کاموں کے کرنے پر جری ہو گئے جن کی وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جرأت نہیں کر سکتے تھے اور وہ کام کرنے آسان لگنے لگے جو اس زمانہ میں آسان نہیں لگتے تھے۔ اور دین کے امور میں سستی اور کاہلی پیدا ہوئی۔ پس انہوں نے تیسری اذان زیادہ کی۔ پس پیغمبر ﷺ اور شیخین کے زمانہ میں جو پہلی اذان تھی وہ چونکہ حاضرین اور غائبین دونوں کو خبردار کرنے کے لئے ہوتی تو مؤذن زور سے اور بلند آواز سے اذان دیتا تاکہ حاضرین کے ساتھ غائبین بھی سن کر آجائیں)۔

پس ہمارے زمانے میں دوسری اذان میں اتنی آواز کو بلند کرنا کافی ہے تاکہ حاضرین خبردار ہو جائیں۔ (زیادہ بلند آواز کی ضرورت نہیں) کیونکہ غائبین کو خبردار کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی جان چکے ہیں (پہلی اذان کی وجہ سے) اور اس طرح مؤذن کو (دوسری اذان کے لئے

) کسی اوپر اور بلند جگہ پر چڑھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ (بلکہ یہ تو پہلی اذان کے وقت کرنا پڑتا ہے۔ دوسری اذان تو خطیب کے سامنے کھڑے ہو کر دینا ہوتی ہے)

پس تو سمجھ لے کیونکہ یہ مفید بحث ہے جبکہ بعض علماء کا گمان یہ ہے کہ آجکل بھی دوسری اذان میں سنت وہی طریقہ ہے جو پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں لوگوں میں تھا۔ (یعنی بلند آواز سے کہنا) جبکہ تو جانتا ہے کہ وہ علت اور وجہ دور ہو چکی ہے کیونکہ پہلی اذان اس کی جگہ لے چکی ہے۔

"وبه قال (حدثنا ادم) بن ابی ایاس (قال حدثنا ابن ابی ذئب) محمد بن عبد الرحمٰن (عن) ابن شهاب "۔[12]

اب اس عبارت میں علامہ قسطلانیؒ حدیث باب کو حل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ندا (اذان) جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے، جمعہ کے دن تو پہلی اذان وہی ہوئی جب امام ممبر پر بیٹھ جاتا۔ پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں بھی، ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی ۔ پس جب عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے اور مدینہ میں لوگوں کی تعداد بڑھ گئی، خلیفہ بننے کے کچھ عرصہ بعد ایک اور اذان زوراء مقام سے دی جانے لگی جب جمعہ کا وقت ہو جاتا۔ ایک روایت میں ہے کہ تیسری اذان دینے لگے، اور دوسری روایت میں ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلی اذان کا حکم دیا تو دونوں روایتوں میں کوئی منافات نہیں۔ اس لئے کہ یہ وجود کے اعتبار سے پہلی اور مشروعیت کے اعتبار تھی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی وجہ سے اور سارے صحابہ رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کی موافقت کی۔ اس پر خاموشی اختیار کر کے اور اس پر نکیر نہیں کی تو گویا اس اذان پر اجماع سکوتی ہوا اور اقامہ پر بھی اذان کا اطلاق کیا تغلیبا کیونکہ دونوں کا فائدہ ایک جیسا ہے۔ یعنی اعلام اور حدیث میں بھی ہے ہر دو آذانوں کے درمیان نماز ہے جو چاہے تو ادھر بھی اذان اور اقامت مراد ہے۔

ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنی روایت میں اضافہ کیا ہے کہ ابو عبداللہ یعنی امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ زوراء مدینہ کے بازار میں ایک جگہ تھی بعض کہتے ہیں کہ یہ بلند تھی منارہ کی طرح اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مسجد کے دروازے کے پاس ایک بڑا پتھر تھا۔

تبصرہ:

باب اور حدیث باب میں مناسبت، مطابقت اور ربط بالکل واضح اور ظاہر ہے کیونکہ باب کا عنوان بھی اذان جمعہ اور حدیث باب میں بھی اذان جمعہ کی بات ہو رہی ہے۔ اب بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ حدیث باب کو لا کر کیا بتلانا چاہتے ہیں اور کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ تو امام بخاریؒ یہ بتلا رہے ہیں کہ پیغمبر ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمعہ کی ایک ہی اذان ہوتی اور امام جب منبر پر بیٹھتے تو مؤذن اس آذان کو دیتا اور بلند آواز سے دیتا تاکہ جو حاضرین ہیں وہ بھی متوجہ اور خبردار ہو جائیں اور جو غائبین ہیں اور ابھی تک نہیں آئے وہ بھی اس اذان کو سن کر فورا پہنچنے کی کوشش کریں۔ پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک اور اذان کا اضافہ کیا جو مدینہ کے بازار میں زوراء سے دی جانے لگی تاکہ لوگ اس کو سن کر مسجد پہنچیں۔ تو یہ اذان ویسے ترتیب کے اعتبار سے تو پہلی اذان تھی کیونکہ پہلے پہلے یہی اذان دی جاتی پھر دوسری جب امام خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھتا اور روایت میں اس کو تیسری اذان کہا گیا ہے حالانکہ ہیں کل دو اذانیں کہ آج تک امت کا اس پر تعامل رہا ہے تو تیسری اس لئے کہا کہ اقامت کو بھی اس میں شمار کیا گیا کیونکہ

وہ بھی تو اذان کی طرح اعلام کا فائدہ دیتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ امام بخاریؒ اس حدیث باب کے ذریعے وہ علت اور وجہ بتلانا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے حضرت عثمان نے ایک اور اذان کا اضافہ کیا۔ اور وجہ یہ بتلادی کہ لوگوں کی کثرت ہو گئی تو ایک اور اذان کا اضافہ کیا۔

اب ہم ذرا ان شروحات مذکورہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ انہوں نے اس بات کی وضاحت کرنے کا کتنا حق ادا کیا۔ تو سب سے پہلے ہم شرح ارشاد الساری کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ علامہ قسطلانیؒ نے اس بات کو کس حد تک بیان کیا ہے۔ علامہ قسطلانی سب سے پہلے حدیث مذکورہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ، ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمعہ کی پہلی اذان وہی ہوئی جو اس وقت دی جاتی تھی جب امام منبر پر بیٹھتا (اور بس) لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت آئی اور لوگ تعداد میں بڑھ گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زورآء مقام سے ایک اور اذان دلوانا شروع کر دی۔ دوسرے نمبر پر کہتے ہیں کہ یہ اذان صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اجتہاد سے شروع نہیں کی گئی بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہ کا اس پر اجماع سکوتی ہوا کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر خاموشی اختیار کی اور نکیر نہ کی تو گویا اس اذان پر اجماع ہوا۔ تیسرے نمبر پر کہتے ہیں کہ اس بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ تیسر یا اذان دلوائی اور بعض میں ہے کہ پہلی دلوائی تو ان میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ یہ اذان وجود کے اعتبار سے پہلی بنتی ہے اور مشروعیت کے اعتبار سے تیسری۔ اس کے بعد زورآء کے متعلق اقوال نقل کئے کہ وہ کیا چیز ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس نے حدیث کی تشریح تو کر دی اپنے الفاظ میں لیکن عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک اور اذان کا اضافہ کیوں کیا اس کی کیا وجہ بنی تو صرف وہی وجہ نقل کی جو بخاریؒ نے بھی نقل کیعینی لوگوں کثرت۔ لیکنیہ تو کوئی خاص وجہ نہیں کیونکہ لوگ تو پہلے زمانوں یعنی شیخین کے زمانہ میں بھی زیادہ تھے۔

اب ذرا لامع الدراری پر نظر ڈالتے ہیں کہ وہ اس کو کیسے بیان کرتے ہیں:

"قوله فلما كان عثمان وكثر الناس -------الخ والناس وان كانوا كثير ين فى زمن الشيخين ايضا------الخ"۔[13]

حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ لوگ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی زیادہ تھے اور عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی، لیکن پیغمبر ﷺ کی صحبت کی قربت کی وجہ سے وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمعہ کے دن اذان اعلام اور خبردار کئے بغیر وہ سویرے اور جلدی سے جمعہ پڑھنے خود پہنچ جاتے۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی اس کی سطوت کی وجہ سے لوگ جلدی سے جمعہ پڑھنے حاضر ہو جاتے تھے۔ ان کو بلانے کے لئے اذان کی ضرورت نہ رہتی۔ اگرچہ تعداد تو ان زمانوں میں بھی زیادہ تھی۔ یہ نہیں کہ ان کے زمانے میں تعداد کم تھی اور عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بہت زیادہ ہو گئی۔ بلکہ زیادتی کے ساتھ ساتھ اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انتہائی حیادار اور شرمیلے تھے کہ جس کی وجہ سے لوگوں میں ڈر ذرا کم ہوا اور وہ ایسے ایسے کاموں کے کرنے کی جرأت کرنے لگے جس کا وہ پہلے زمانے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دین کے کاموں میں سستی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ جمعہ کی نماز میں تاخیر سے آتے تو اس مقصد کی خاطر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک اور اذان کا اجراء کرایا جو جمعہ کا وقت داخل ہوتے ہی زورآء کے مقام سے زور سے دلوائی جاتی تاکہ اس کو سن کر غائبین جلدی سے مسجد میں پہنچ آئیں اور پھر دوسری اذان اس وقت دیتے جب امام منبر پر بیٹھتا تو اس کے سامنے دیتے۔ علامہ گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ اس دوسری آزاد کو اب زور سے اور بلند سے دلوانے کی ضرورت نہیں جیسے شیخین رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوتا کیونکہ یہ ضرورت اب پہلی اذان سے پوری ہو چکی، لوگ اس سے خبر دار ہو چکے۔ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد ساری امت کا اس پر تعامل ہو گیا اور آج تک یہ دونوں اذانیں دلوائی جاتی ہیں لیکن یہ بات ہے کہ آج بھی یہ دوسری اذان کو صرف اتنی بلند آواز سے دلوائی جائے جس سے مخاطبین خبر دار ہو جائیں۔ زیادہ بلند اور زور سے دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ غائبین کو پہلی اذان سے خبر دار کیا جا چکا ہے۔

اب ذرا انصاف کی نظر سے دیکھیں تو حضرت نے لامع الدراری کے اندر اس مقصد کو کس جامع، مانع اور مختصر انداز سے بیان کیا کہ بات بھی واضح ہو گئی اور اصل وجہ بھی معلوم ہو گئی کہ دوسری اذان کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔

4- باب: صلوة الطالب والمطلوب راكبا و ايماً:

دشمن کی تلاش میں نکلنے والے اور جن کی تلاش میں دشمن ہوں، ان کی نماز سواری پر اور اشاروں سے:

حدیث: "عن ابن عمر رضی الله عنه قال قال النبی ﷺ لنا لما رجع من الاحزاب لا يصلين احد العصر الا فی بنی قريظة فادرک بعضهم العصر فی الطريق"۔[14]

ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ احزاب سے فارغ ہوتے ہی ہم سے یہ فرمایا تھا کہ کوئی شخص بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے عصر نہ پڑھے۔ لیکن جب عصر کا وقت آیا تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہ نے راستہ ہی میں نماز پڑھ لی۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہ نے راستہ ہی میں نماز پڑھ لی۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے ہم نماز نہیں پڑھیں گے اور کچھ حضرات کا خیال تھا کہ ہمیں نماز پڑھ لینی چاہیئے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ نہیں تھا (کہ نماز ہی نہ پڑھی جائے بلکہ صرف جلدی پہنچنے کی کوشش کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا) پھر جب آپ ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے کسی پر بھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا تھا۔

1- "و قال الوليد ذكرت للاوزاعی - صلوٰة شرجيل بن السمط و اصحابه علىٰ ظهر الدابة فقال كذلک الامير"۔[15]

ولید نے کہا کہ میں نے اوزاعی سے شرجیل بن سمط اور ان کے ساتھیوں کی سواری پر نماز کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ جب نماز چھوٹ جانے کا خوف ہو تو ہمارا مسلک بھی یہی ہے اور ولید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ بنی قریظہ پہنچنے سے پہلے کوئی شخص عصر نہ پڑھے۔ یہ ترجمۃ الباب اور حدیث باب لانے سے امام بخاریؒ کی غرض کیا ہے تو بطور تمہید پہلے یہ ایک مسئلہ بیان کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ: طالب (یعنی دشمن کی تلاش میں نکلنے والا) اور مطلوب (یعنی جس کی تلاش میں دشمن ہو اور وہ جان بچانے کی فکر میں ہو)۔

تو اب مسئلہ یہ ہے کہ آیا طالب اور مطلوب دونوں سواری پر سوار رہتے ہوئے اشارے سے فرض نماز پڑھ سکتے ہیں یا ان کو نیچے اتر کر نماز پڑھنا ہے۔ تو کیا اس حکم میں دونوں برابر ہیں یا کوئی فرق ہے؟ تو اس بارے میں امام مالکؒ کا جمہور سے اختلاف ہے اور وہ بھی صرف طالب کے بارے میں کیونکہ مطلوب سواری پر سوار رہتے ہوئے اشارے سے فرض نماز بھی پڑھ سکتا ہے کیونکہ اس کی جان کو خطرہ ہوتا ہے اور یہ بالاتفاق جائز ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ کیونکہ شرجیل بن سمط اور اس کے ساتھ مطلوب تھے۔ دشمن کا خطرہ تھا اس لئے ساتھیوں سمیت صبح کی نماز سواری پر سوار رہتے ہوئے اشارے سے نماز پڑھ لی تھی۔ باقی رہ گیا طالب کہ وہ اس طرح کر سکتا ہے کہ نہیں۔ تو اس میں جمہور اور مالکؒ کا اختلاف ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک طالب بھی سواری پر سوار رہ کر اشاروں سے نماز پڑھ سکتا ہے۔

وہ طلب کو مطلب پر قیاس کرتے ہیں کہ جیسے اس حدیث باب سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو بنی قریظہ کی طلب میں جانے والوں کو پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے نماز نہ پڑھو، تو کچھ صحابہ رضی اللہ عنہ نے راستہ میں پڑھ لی۔ تو لازمی بات ہے کہ انہوں نے سوار ہو کر نماز پڑھی ہو گی اور دوسرا طریقہ استدلال یہ ہے کہ دیکھو کہ جب پیغمبر ﷺ نے ان کو نماز نہ پڑھنے کی اجازت دے دی تو پھر سوار ہو کر پڑھنے کی بدرجہ اولیٰ اجازت ہو گی۔

جبکہ جمہور کے نزدیک طالب اتر کر زمین پر فرض نماز پڑھے گا اسلئے کہ سواری پر سوار ہو کر اشاروں سے پڑھنا صحیح نہیں۔ ان کی دلیلیہ ہے کہ نماز فرض ہے اور دشمن کی تلاش میں نکلنا مستحب ہے۔ تو مستحب کی وجہ سے فرض کو نہیں چھوڑیں گے۔ باقی امام مالکؒ کا استدلال حدیث سے صحیح نہیں کیونکہ پیغمبر ﷺ نے جو فرمایا کہ بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے کوئی نماز نہ پڑھے تو اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان کو نماز نہ پڑھنے کی رخصت دی بلکہ مقصد ان کو جلدی پہنچنے کی ترغیب دینا تھا۔

خلاصہ یہ کہ امام بخاریؒ کا مقصد اس باب کو قائم کرنے سے امام مالکؒ کے مذہب کو ثابت کرنا ہے کیونکہ باب میں طالب و مطلوب دونوں کو اکٹھے لا کر کہا کہ طالب اور مطلوب کا سوار ہو کر اشارے سے نماز پڑھنا پھر اس کے بعد اوزاعی اور ولید کا مکالمہ نقل کیا اور اس کے بعد حدیث لائے جس میں بنو قریظہ کا واقعہ مذکور ہے۔ اور حدیث مذکورہ سے باب میں مذکورہ مسئلہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس سے استدلال کرنا چاہتے ہیں جیسے اختلافی مسئلہ میں ذکر ہو چکا۔ اب بات یہ ہے کہ یہ استدلال صحیح ہے کہ صحیح نہیں تو اس کو ہم اب لامع الدراری کی عبارت میں دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے بیان کرتے ہیں:

"قوله صلوٰة شرجيل بن السمط و كانوا قد صلوا على ظهور دوابهم وانكروا على من نزل منهم ثم ان قصته لم يستوف"۔[16]

عبارت مذکورہ میں علامہ گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ شرجیل بن سمط اور اس کے ساتھیوں نے اپنی سواریوں کے پشت پر (سوار ہو کر) نماز پڑھی تھی۔ اور ان میں جس نے اتر کر نماز پڑھی تھی (یعنی اشتر نخعی نے) تو اس پر انہوں نے نکیر بھی کی تھی (کہ اس نے اللہ کی حکم کی مخالفت کی) پھر اس (شرجیل) کا قصہ پورا بھی نہیں۔ یہاں تک کہ معلوم ہو جائے کہ آیا وہ طالب تھے یا مطلوب۔ پھر جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ بنو قرئضہ کی طرف گئے تھے ان سے استدلال کرنا بھی تام اور پورا نہیں۔ کیونکہ یہ استدلال موقوف ہے اس بات کے ثبوت پر کہ انہوں نے سوار ہو

کر نماز پڑھی تھی اور یہ ثابت نہیں۔ حدیث سے صرف اتنا ثابت ہے کہ انہوں نے راستہ میں نماز پڑھی تھی اور ظاہر یہی ہے کہ انہوں نے اتر کر نماز پڑھی ہو گی۔ کیونکہ اگر انہوں نے سوار ہو کر اشارے سے نماز پڑھی ہوتی تو اس پر نکیر کرنے والا ے جو دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہ تھے وہ ان پر مطلع ہی نہ ہوتے (اور نہ ان پر نکیر کرتے) اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ پیغمبر ﷺ کا ہمارے بارے یں یہ ارادہ نہ تھا (کہ ہم نماز ہی نہ پڑھیں بلکہ جلدی پہنچنے کا تھا) اگر صحابہ رضی اللہ عنہ کے بارے یں یہ ثابت بھی ہو جائے کہ انہوں نے سوار ہو کر نماز پڑھی تھی تو یہ اس احتمال پر ہو گا کہ ان کو بعد میں دوبارہ نماز پڑھنے اور لوٹانے کا حکم دیا گیا ہو۔ اور اگر یہ تسلیم کر بھی لیں کہ ان کو دوبارہ لوٹانے کا حکم نہیں ملا تو پھر یہ کہ ان کی طرف سے جو یہ وقتی فرض ساقط ہوا۔ اس اشارے (سے پڑھنے) سے۔ تو یہ اس وجہ سے کہ نص میں جو وارد ہے ان کے اس کے سمجھنے میں غلطی کی وجہ سے تو گویا وہ اس اجتہاد میں غلطی پر تھے تو یہ نماز گویا ان کی رائے کے مطابق واقع ہوئی اور ادا ہوئی۔

اب اسی مذکورہ مسئلہ کو دوسری شرح التواری میں دیکھتے ہیں کہ وہ وہ کس طرح اس کو حل کرنے کا حق ادا کرتے ہیں۔

"وقال الوليد - ذكر ت الاوزاعى صلاة شرجيل بن السمط و اصحابه على ظهر الدابة - قال كذلك الامر عندنا اذا تخوفت الفوت "۔[17]

یہ باب اس بارے میں کہ طالب اور مطلوب کی نماز سوار ہونے کی حالت میں اشارے سے۔ ولید کہتے ہیں کہ میں نے اوزاعیؒ سے ذکر کیا شرجیل اور اس کے ساتھیوں کی نماز کے بارے میں جو سواری کی پشت پر تھی تو اوزاعی نے کہا کہ ہمارے نزدیک بھی حکم اسی طرح ہے جب فوت ہونے کا خوف ہو اور ولید نے پیغمبر ﷺ کے اس فرمان سے استدلال کیا۔

اس حدیث میں ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احزاب سے لوٹے تو فرمایا کہ کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ میں پس بعض کہنے لگے کہ ہم تو نماز پڑھ لیتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ کا ہمارے بارے یں یہ ارادہ نہ تھا (کہ ہم نماز ہی نہ پڑھیں بلکہ مقصد جلدی پہنچنا تھا) پس نبی ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو آپ ﷺ نے کسی پر بھینا گواری کا اظہار نہیں کیا۔

علامہ گنگوہی فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ اگر تو کہے کہ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ سے استدلال کرنے کے طریق پر اشکال ہے کیونکہ اس حدیث میں صرف اتنا ہے کہ ایک فریق نے (راستہ میں) نماز پڑھ لی تھی، یہ بیان نہیں آیا کہ وہ سوار تھے یا اتر گئے تھے، تو حدیث مطلق ہے اور ترجمۃ الباب میں خصوصی ہے تو ان کے درمیان مطابقت کہاں ہے کہ یہ اس کے لئے سبب بنے۔ تو یہیں یہ کہتا ہوں کہ یہ اشکال ابن بطال پر ہے۔ کیونکہ اس نے قیاس سے استدلال کیا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ مطابقت ہے کیونکہ جب ایک فریق نے نماز میں تاخیر کی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور بنو قریظہ پہنچے تو جب س فریق کیلئے جائز تھا کہ نماز کو وقت سے مؤخر کر دیں حالانکہ نماز تو وقت میں فرض ہے تو اس طرح پھر یہ بھی جائز ہے کہ ارکان کے اتمام کو ترک کر دیا جائے اور ایماء (اشارے) کی طرف انتقال کیا جائے۔

تبصرہ:

ہم نے دونوں شروح پر نظر ڈالی کہ مسئلہ مذکورہ کو کیسے حل کیا، تو "التوراي" کے شارح نے کہا کہ باب اور حدیث میں مناسبت نہیں پھر اعتراض اور جواب کی صورت میں اس کو بیان کیا کہ طالب سوار ہو کر نماز پڑھے تو اس بارے میں حدیث سے استدلال صحیح نہیں ہے اگرچہ ابن بطال وغیرہ نے استدلال کیا ہے کہ جب ایک فریق نے نماز ہی نہ پڑھی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا تو جب ان کو تاخیر کی گنجائش تھی تو پھر دوسرے فریق کیلئے بھی اتنی گنجائش ہو گی کہ وہ اشارے سے سوار ہو کر نماز پڑھے۔ شارح اس انداز میں تقریر نہ کر سکے کہ اس سے مسئلہ بالکل بے غبار ہو جائے۔ اب ذرا لامع الدراری پر نظر دوڑاتے ہیں کہ وہ کس انداز میں مسئلہ کا حل پیش کرتے ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ نے نہایت جامع و مانع اور مختصر انداز میں بیان کیا کہ اختلافی مسئلہ ہے صرف طالب کا کہ وہ سوار ہو کر اشارے سے نماز پڑھے کہ نہ پڑھے۔ تو اب یہ ثابت کرنا کہ وہ طالب سوار ہو کر اشارے سے پڑھ سکتا ہے اور پھر استدلال اس حدیث سے کرنا تو علامہ گنگوہیؒ نے اپنی عبارت میں انتہائی اختصار سے ثابت کیا کہ اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں۔

حضرت شیخ گنگوہیؒ کو اللہ نے یہ خصوصیت دی ہے کہ بسا اوقات وہ مشکل کا ایسا حل لے آتے ہیں جس سے بڑی بڑی کتابیں خالی ہیں۔ پس میں نے اس بڑے سمندر اور برسنے والے بادل سے ان چند قطروں (۴ مثالوں) پر قناعت اختیار کر لی جو مقصود پر واضح دلائل ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ مختصر اور عمدہ کلمات ائمہ کی بڑی بڑی کتابوں اور شروحات سے مستغنی کر دیتے ہیں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ یہ بڑے بڑے شروح اپنی ضخامت اور طوالت کے باوجود حضرت گنگوہیؒ کے ان مختصر کلمات اور تقریر سے مستغنی نہیں ہیں۔

خلاصۃ البحث

اس مقالے میں میں نے سب سے پہلے اس شرح کی ترجمۃ الباب کے مقصد کے حوالے سے بحث کی ہے اور اس چیز کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح حضرت مولانا گنگوہیؒ ترجمۃ الباب کے مقصد کو واضح کر دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شرح کی جامعیت پر روشنی ڈالی ہے۔ مختلف فیہ مسائل میں حضرت مولانا گنگوہیؒ کا جو اسلوب ہے اس کو تفصیل سے باقاعدہ مثالوں سے واضح کیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے "باب القنيا وهو واقف على اظهر الدابة" کے تحت بیان شدہ مسائل پر صاحب لامع الدراری کا تفصیلی تبصرہ نقل کیا ہے۔ اس کے بعد "باب الوضوء الرجل مع امرأته" کے تحت بیان شدہ مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور احادیث اور آثار کے درمیان باقاعدہ تطبیق بیان کی ہے۔ تیسرا مسئلہ "باب الأذان يوم الجمعة" کے تحت بیان شدہ دو آذانوں کے مسئلہ کی وضاحت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ چوتھا مسئلہ "صلوٰة الطالب والمطلوب راكبا و ايما" کے تحت بیان شدہ مسئلہ یعنی سوار ہو کر نماز پڑھنے کی تفصیلی وضاحت کی ہے۔

اس مقالہ میں درج بالا مسائل کی روشنی میں شرح کا ادبی آہنگ و منہج و اسلوب بیان کیا گیا ہے۔

References

[1]- Al Quran: 110:3.

[2]- Mirathi, Molana Aashiq Ilahi, Tazkirat al Rasheed, Idarah Islamiyat, Lahore, 2005, p. 204.

[3]- Molana Muhammad Zakariya, al Kunz al Mutwari, Kwait, 1999, V.1, p. 90.

[4]- Gangohi, Rasheed Ahmed, Lamai al Darari Sarh Sahi Buhakhri, Maktaba Rashidya, V.1, p. 9.
[5]- Ibid, V.1, p. 92.
[6]- Al Asqlani, Ahmed bin Ali bin Hijar, Fatah al bari, Maktaba Darul Muarifat, Beirut, 1379 AH, Vol. 1, p. 180.
[7]- Lamai al Darari, Vol.1, p. 93.
[8] - Ibid, Vol.1, p. 94.
[9] - Al Qustilani, Ahmed bin Muhammad bin Abu Bakar, Irshad al Sari, Egypt, 1423 AH, Vol. 1, p. 273.
[10] - Lamai al Darari, Vol.1, p. 21.
[11] - Ibid, Vol.2, p. 22.
[12] - Irshad al Sari, Vol.2, p. 178.
[13] - Lamai al Darari, Vol.1, p. 24.
[14] - Ibid, Vol.2, p. 33.
[15] - Ibid, Vol.2, p. 34.
[16] - Ibid.
[17] - Al Kanz al Mutwari, Vol.2, p. 110.